بیسویں صدی میں جدید عصری علوم کی ترویج اور اہمیت وافادیت کے تناظر میں
پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری کے افکار و نظریات....ایک تجزیاتی مطالعہ

Proliferation and Significance of 'Modern' Contemporary Disciplines of Knowledge in 20th Century AD-An Analytical Study of Syed Muhammad Suleman Ashraf Bihari's Ideologue

Muhammad Ahmed Tarazi
Researcher
Email:mahmedtarazi@gmail.com

Dr. Mazher Hussain
Assistant Professor
Department of History
Islamia University, Bahawalpur

ABSTRACT

Syed Muhammad Suleman Ashraf Bihari was one of Muslim stalwarts who, by the dint of his acumen, vision and ability, provided multifarious guidance to the Muslims of Indian Subcontinent at the very crucial juncture of History, especially when the Muslims were standing helpless at the crossroads in the face of the Modern Education the very gift the British Colonizers gave to the Indians. Syed Suleman came on the forefront with a clear piece of mind and prepared Muslim Nation to face this upheaval by envisioning them about the dark side of the so called "Modern Education". He was of the view that the Education could only be said "modern" if it did not harm the very basis of Islamic teachings especially its spiritual essence which was non-materialistic and was meant for world hereafter. His efforts bore fruit and Muslim youth became well-equipped which, in turn, proved backbone for the Pakistan Movement in the forthcoming years. Even Jinnah was the prime admirer of the youth of Aligarh which was vanguard of the Independence Movement. The Research paper in highlights the ideologue of Syed Muhammad Suleman Ashraf who was a great advocate of modern education without making any compromise on the "Islamic essence" of both mode and content of the education and its essentiality for the Two-Nation Theory.

Keywords: *Syed Muhammad Suleman Ashraf Bihari, Indian Subcontinent, Modern Education, British Colonizers, Islamic essence.*

سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری کی ذاتِ گرامی ہماری قومی و ملی تاریخ کا ایک انمٹ باب ہے۔آپ کی شخصیت جتنی دلکش تھی اُتنی ہی ہمہ گیر بھی تھی۔آپ بیک وقت مایہ ناز دانشور، دیدہ ور مدبّر، مذہبی و سیاسی رہنماءاور ایک عظیم مفکر تھے اور آپ نے عملی زندگی کے ہر میدان میں اپنی عظیم شخصیت کا نہ مٹنے والا نقش ثبت کیا۔اُنیسویں صدی کی ابتدائی چوتھائی میں عالم اسلام اور بالخصوص مسلمانانِ ہند میں قومی و ملی شعور کی بیداری میں سیّد سلیمان اشرف کے کردار کو کسی طور نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔آپ نے تحریکِ خلافت، ترکِ موالات، ہجرت، ہندو مسلم اتحاد اور ترکِ گاؤکشی کے ہیجانی دور میں مسلمانانِ ہند کو گاندھی اور گاندھی نوازوں کی منافقانہ سیاست سے بچانے کی بھرپور کوشش کی اور اُس نازک اور پُرفتن دور میں اسلامیانِ ہند کی راہنمائی کا ہی فریضہ سرانجام نہیں دیا بلکہ بلاخوف لومۃ لائم مشرکین ہند کے ساتھ مسلمانوں کے اختلاط و اتحاد کے خطرناک نتائج سے بھی آگاہ کیا اور علماء کو اُن کی دینی و ملی ذمہ داریوں کا احساس دلا کر اپنی بالغ نظری، علمی ثقاہت اور سیاسی بصیرت کا ایک روشن اور تابناک ثبوت بھی فراہم دیا ہے۔ذیل میں پہلے پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری کا مختصر تعارف اور پھر آپ کے جدید عصری علوم کی ترویج اور اہمیت وافادیت کے حوالہ سے افکار و نظریات کو پیش کیا جائے گا۔

پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری کا تعارف

پروفیسر سیّد سلیمان اشرف ۱۸۷۸ء میں صوبہ بہار کے ایک مردم خیز دیہات محلہ میرداد، ضلع نالندہ کے ممتاز سیّد گھرانے میں پیدا ہوئے۔والد کا نام مولانا حکیم سید عبداللہ تھا جن کا انتقال آپ کے بچپن ہی میں ہوگیا۔آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے اعمامِ محترم سے حاصل کی۔آپ کا سلسلۂ نسب مخدوم سید اشرف سمنانی کچھوچھویؒ کے بھانجے سید عبدالرزاق جیلانیؒ سے جاملتا ہے۔مولانا کے چار چچا تھے۔جن سے مختلف اوقات میں مختلف کتابیں پڑھیں۔بعد میں بہار اسکول میں داخلہ لیا، لیکن دسویں جماعت میں طبیعت دینی تعلیم کی جانب مائل ہوگئی۔چنانچہ اسکول کو خیرباد کہا اور مولانا نور محمد اصدقی خلیفۂ اعظم شاہ قیام اصدقؒ، پیر بگھہ جموانواں سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی اور اُن کے دامنِ عقیدت سے وابستہ ہو کر اخذِ طریقت کیا۔[1] آپ سلسلہ اشرفیہ کے عظیم بزرگ حضرت سیّد علی حسین اشرفی میاں جیلانیؒ سے طالب اور خلافت یافتہ تھے۔آپ کو محدثِ بریلوی مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ سے بھی خلافت و اجازت حاصل تھی۔[2]

سید سلیمان اشرف نے "مدرسہ اسلامیہ" استھانواں میں مولانا سید محمد احسن استھانواں سے بھی چند کتابیں پڑھیں۔مزید تعلیم کے لیے "مدرسہ ندوۃ العلماء" میں مولانا احمد حسن کانپوری کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے۔مولانا ہدایت اللہ جونپوریؒ منطق و معقولات میں اپنے زمانے کے امام اور مجاہدِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء مولانا فضلِ حق خیرآبادیؒ کے مایہ ناز شاگرد تھے۔سید سلیمان اشرف نے اسی خیرآبادی چشمۂ علم سے فیض اٹھایا۔سیّد صاحب کے قابل ذکر اساتذہ میں ایک نام فقیہ العصر مولانا یار محمد بندیالویؒ کا بھی ملتا ہے۔[3] مولانا ہدایت اللہ جون پوریؒ کے انتقال کے بعد نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی کوششوں سے آپ کی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں لیکچرر شعبۂ دینیات کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔[4]

بعد ازاں مئی ۱۹۰۹ء میں پروفیسر اور ۱۹۲۱ء میں کالج کے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بن جانے کے بعد آپ صدر شعبۂ دینیات کے عہدے پر اپنے وصال تک فائز رہے۔پروفیسر سیّد سلیمان اشرف نے عسر و یسر ہر حال میں بڑے جاہ و جلال سے زندگی بسر کی۔یہاں تک کہ وہ دن بھی آپہنچا جب کہ ہر فرد کو "کل من علیھا فان" کا جام پینا پڑتا ہے۔۲۶ اپریل ۱۹۳۹ء کو برصغیر کے اِس عظیم بطلِ حریت کا انتقال ہوا۔[5]

سیّد سلیمان اشرف کے مشہور تلامذہ میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری (بانی المرکز الاسلامی، کراچی)، پروفیسر محمد محمود احمد (سابق صدر شعبۂ فلسفہ، مسلم یونیورسٹی)، ڈاکٹر ذاکر حسین (بھارت کے پہلے مسلمان صدر)، سید امیر الدین قدوائی (پاکستانی قومی پرچم کے خالق)، پروفیسر رشید احمد صدیقی (اردو کے مشہور ادیب ونقاد)، ڈاکٹر سید عابد احمد علی (سابق ڈائریکٹر، پنجاب پبلک لائبریری)، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی (ممتاز نقاد ومحقق اور ماہرِ تعلیم)، مولانا ابرار حسین فاروقی گوپامئوی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، (محقق، ماہرِ لسانیات، مترجم وماہرِ تعلیم)، ڈاکٹر شبیر احمد غوری اور حافظ غلام غوث وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

سیّد سلیمان اشرف برعظیم کے اُن ممتاز علمائے ذی وقار میں سے ہیں جنھیں قدرت نے سیاسی بصیرت وبصارت دونوں سے نوازا تھا۔ آپ کا دل ملتِ بیضا کی فکری بیداری اور اُس کے روشن مستقبل کے لیے آشنائے درد تھا۔ آپ کے نزدیک اسلام محض رسوم وعبادات اور عقائد کا ہی نام نہیں بلکہ ایک فعال، سرگرم اور متحرک نظریۂ حیات ہے۔ جس میں حریت، آزادی، بے نیازی، زورِ حیدری اور فقرِ بوذر کو کلیدی حیثیت حاصل ہے اور جو ہر ظلم وجبر، محکومی اور غلامی کے خلاف سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی فکر وعمل کے ساتھ آپ نے برعظیم میں اٹھنے والی تحریکِ خلافت، ترکِ موالات، تحریک ہجرت اور ترکِ گاؤکشی جیسی اسلام اور مسلمان دشمن تحاریک کے اثرات ومضمرات سے قوم کو نہ صرف بروقت آگاہ کیا بلکہ اپنی سیاسی بصیرت وآگہی سے مستقبل کا لائحہ عمل بھی متعین فرمایا اور اِس ضمن میں اپنے کرب و آگہی کی داستان ''البلاغ'' (۱۹۱۱ء)، ''الخطاب'' (۱۹۱۵ء)، ''الرّشاد'' (۱۹۲۰ء)، ''النور'' (۱۹۲۱ء) اور ''السبیل'' (۱۹۲۴ء) کی صورت میں اُردو زبان اور اسلامی ادب کے سانچے میں پیش کی۔ جن کے مطالعے سے آپ کے افکار ونظریات، سیاسی شعور اور فکری بالغ نظری کا پتا چلتا ہے۔ آپ کے یہ سیاسی افکار ونظریات عہدِ حاضر میں پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے خاص اہمیت وافادیت رکھتے ہیں۔

تاریخی پس منظر (Retrospect)

تعلیم قوموں کی قسمت کی کنجی ہوتی ہے، جو قوم جس قدر تعلیم یافتہ ہوگی وہ اتنی ہی ترقی یافتہ بھی ہوگی۔ دنیا میں کسی قوم وملک کی ترقی کا دار ومدار تعلیم پر منحصر ہوتا ہے۔ تعلیم ہی ہمہ جہت ترقی کی ضامن ہوتی ہے۔ تعلیم کی اہمیت وافادیت قدیم زمانے سے ہر طبقہ و قوم میں رہی ہے۔ ماضی میں مسلمان تعلیم کی ضرورت واہمیت سے آگاہ تھے اِس لیے وہ زندگی کے ہر شعبہ میں آگے رہے۔ اُنہیں عروج حاصل ہوا اور وہ دنیا میں ایک مضبوط سیاسی طاقت بن کر ابھرے۔

یہ درست ہے کہ جب کوئی قوم تعلیمی اعتبار سے پسماندہ ہو جاتی ہے تو اُس کی نمائندگی زندگی کے ہر شعبہ میں کمزور ہو جاتی ہے اور اُس کا معاشی، سماجی، اقتصادی، تہذیبی وثقافتی ڈھانچہ بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ یہی حال برعظیم پاک وہند کے مسلمانوں کا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلم حکمرانی کا سورج کیا ڈوبا۔ فکری وعلمی افلاس اپنے ساتھ غلامی، محکومی اور نقاہت کا دور بھی لے کر آیا۔ مسلمان سیاسی، سماجی، معاشی اور تعلیمی طور پر جمود وانحطاط کا شکار ہوگئے۔ پروفیسر سیّد سلیمان اشرف اُس بحرانی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جب اپنی سلطنت علومِ اسلامیہ کی حمایت وحفاظت کے لیے نہ رہی تو ترقی کے سارے زینے ٹوٹ گئے اور مسلمانوں کے علوم وفنون کی عمارت منہدم ہوگئی.... جب سلطنت جاتی ہے تو محاسن وکمال صرف اُس قوم سے رخصت ہی نہیں ہو جاتے بلکہ کافی مدت کے لیے اُسے دامِ حیرت میں ایسا گرفتار کر جاتے ہیں کہ وہ قوم اُس انقلاب سے متاثر ہو کر عالم سراسیمگی میں

ششدر و حیران ہو جاتی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہندوستان سے مسلمانوں کی سلطنت جب زائل ہوئی اور ۱۸۵۷ء کے واقعہ نے اُن کی آنکھیں کھولیں تو اُنہیں معلوم ہوا کہ سلطنت کے ساتھ کمالات و محاسن بھی اُن سے رخصت ہو گئے۔"[6]

خوف اور سراسیمگی نے مسلمانوں کی عقل و خرد کو ماؤف کر دیا تھا۔ بے بسی و لاچاری نے تمام راہیں مسدود کر دیں۔ اگر کچھ کرنا بھی چاہتے تو کر نہیں سکتے تھے۔ حواس پراگندہ، عقل حیران و ششدر اور سوچنے، سمجھنے، پہچاننے اور تمیز کی طاقت و صلاحیت سے محروم۔ بقول شاعر

مسلمانوں پہ ہے مردہ دلی چھائی ہوئی ہر سو
سکوتِ مرگ نے چادر ہے پھیلائی ہوئی ہر سو

اسلامیانِ ہند کی اِس حالت کو بیان کرتے ہوئے سیّد سلیمان اشرف اپنی کتاب "السبیل" میں رقمطراز ہوتے ہیں:

"ہندوستان سے جب مسلمانوں کی رہی سہی سلطنت بھی فنا ہو گئی تو دفعتاً اُن کے قلب پر ایسا صدمہ پہنچا کہ دل و دماغ اُن کے بالکل ماؤف ہو گئے عقل خیرہ ہو گئی اور حواس پراگندہ۔ اُس سراسیمگی میں انہیں قطعاً اِس کا احساس نہ رہا کہ کس شے کو اخذ کرنا چاہیے اور کس چیز کو ترک کرنا چاہیے۔ حیران و ششدر تھے قوت ممیزہ بیکار ہو رہی تھی اِس بے ہوشی میں بہت سے قابل ترک اُمور اختیار کر لیے گئے اور جنھیں کسی حال میں بھی ترک کرنا روا نہ ہو سکتا تھا اُنہیں قطعاً چھوڑ بیٹھے۔ انہی فروگذاشتوں کی فہرست میں بہت جلی قلم اور نمایاں حروف میں علومِ اسلامیہ کا ترک بھی مندرج ہو گیا۔ مسلمانوں نے خیال کیا جب اپنی سلطنت اپنے علوم کی محافظت کیلئے نہ رہی تو پھر اِس یتیم کی پرورش ایک مفتوح قوم اور محکوم رعایا کے لیے کسی طرح سازگار نہیں ہو سکتی۔"[7]

اِس شکست خوردہ طرزِ فکر نے مسلمانوں کو علومِ اسلامیہ سے ہی دور نہ کیا بلکہ دنیاوی تعلیم میں بھی وہ دیگر اقوام سے پیچھے رہ گئے۔ اِس علمی، فکری، سیاسی، معاشی اور معاشرتی زوال وانحطاط کو بیان کرتے ہوئے خواجہ غلام السیّدین (پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی) لکھتے ہیں:

"اٹھارویں صدی اور اُنیسویں صدی کا نصف اوّل ہندوستانیوں کیلئے نہایت تاریک زمانہ گزرا ہے۔ کیونکہ یہ عام طور پر دماغی افلاس اور جمود کا دور تھا اور قوم کی تمام قوتیں اور کاروبار افسردگی کے عالم میں تھے۔ سلطنتِ مغلیہ کا زوال ہو چکا تھا اور علوم و فنون صنعت و حرفت، فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر کے دور عروج کے بعد اب بالعموم لوگوں پر عام اِس سے کہ وہ مسلمان تھے یا ہندو سستی، غفلت اور جہالت چھائی ہوئی تھی۔ پرانا نظام درہم برہم ہو چکا تھا، پرانی بساط اُٹھ چکی تھی، پرانے ادارے ٹوٹ چکے تھے یا ٹوٹ رہے تھے اور نیا نظام ابھی قائم نہیں ہوا تھا۔ قومی زندگی کے ہر شعبے میں بد نظمی اور انتشار کا عالم تھا۔ اِس بے سروسامانی کے زمانے میں تمام قوم پر بحیثیتِ مجموعی ایک سکرات کا عالم طاری تھا جس میں لوگ اپنی کھوئی ہوئی شخصیت اور وقار کو حاصل کرنے کے لیے بالارادہ کوشاں نہیں تھے بلکہ اندھیرے میں چاروں طرف ٹٹول رہے تھے۔"[8]

اُدھر برعظیم پاک وہند میں انگریزوں کے قبضۂ اقتدار نے جہاں نظامِ سیاست کے ساتھ ساتھ کم وبیش زندگی کا ہر شعبہ تہہ وبالا کر دیا تھا۔ وہاں تعلیم کے شعبہ کا متاثر ہونا بھی ایک لازمی اَمر تھا۔ تاہم یہ کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ نئی روشنی کے علمبردار اِس موضوع پر بھی اپنی رعایا سے وہ بدترین انتقام لیں گے۔ جس کی مثال صدیوں میں بھی نہیں ملے گی۔ بقول ڈاکٹر احسن اقبال:

"انگریزوں کی پوری کوشش یہ تھی کہ ہندوستانی باشندے زیادہ سے زیادہ جاہل رہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ تعلیم حاصل کر کے یہ لوگ ہمارے اقتدار کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔ اِس لیے اگر تعلیم کا نظم کیا بھی، تو وہ محض عیسائیت (کے فروغ) کے لیے، ورنہ اعلیٰ تعلیم کا ہندوستانی باشندوں کے لیے کوئی نظم نہ تھا۔"[9]

در حقیقت قوموں کے عروج وزوال کی ذمہ دار خود قومیں ہوا کرتی ہیں، دوسرے نہیں۔ دوسرے اپنی حریف قوموں کی کمزوریوں کا فائدہ ضرور اٹھاتے ہیں۔ انگریز نے مسلمانوں میں پھیلے ہوئے خوف وہراس اور سراسیمگی کا پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ اِس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر برعظیم میں مغربی طرز کے تعلیمی ادارے کھولے گئے تو اِس سے عوام میں بیداری آئے گی اور جس طرح امریکہ وغیرہ میں جدید علوم کی درسگاہیں قائم ہو جانے کے بعد ہمیں امریکیوں کو آزادی دینی پڑ گئی تھی اُسی طرح برعظیم جو کہ سونے کی چڑیا سے کم نہیں ہے۔ اگر ہم نے یہاں پر جدید تعلیمی ادارے قائم کر دیئے تو ایک نہ ایک دن ہمیں یہاں سے لازماً بوریا بستر گول کرنا پڑے گا۔ اِس لیے بہتر یہی ہے کہ یہاں کے لوگوں کو تعلیمی لحاظ سے پسماندہ رکھا جائے۔

تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انگریز حکومت کو اپنی رائے بدلنی پڑی اور حکومتی سرپرستی میں کئی تعلیمی ادارے وجود میں آئے۔ جن کا پس پردہ مقصد عیسائیت کی فروغ واشاعت کے ساتھ "تعلیم برائے ملازمت"[10] اور "ہندوستانی سر میں انگریز دماغ رکھنا تھا"[11] یعنی ایک ایسا طبقہ وجود میں لانا تھا جو رنگ ونسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو لیکن ذوق، ذہن، اخلاق اور فہم وفراست کے اعتبار سے انگریز ہو۔ چنانچہ اِس اندازِ تعلیم کا سب سے بڑا نقصان بیان کرتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا:

"اِس تعلیم کے بندے اپنی روایات وتہذیب اور اپنے اخلاق اور تاریخ سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ چیزیں جو قومیت کی بنیاد ہیں، اُن کی نظروں میں حقیر معلوم ہونے لگتی ہیں، وہ مغربی تہذیب ورسوم کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں.... جو (ہمارے) قومی نظام کے لیے نہایت خطرناک ہے۔"[12]

سیّد سلیمان اشرف .... مسلمانانِ ہند کی تعلیمی حالتِ زار کا ادراک وتدارک

چنانچہ اِن عوامل کو سامنے رکھتے ہوئے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام (جسے بعد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا نام دیا گیا) دسمبر ۱۸۸۶ء میں عمل میں آیا۔ اِس ادارے کے قیام کا بنیادی مقصد علی گڑھ کے علاوہ دیگر علاقوں کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات پر غور وخوض اور اُن میں جدید تعلیم کا شوق پیدا کرنا، نیز مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کر کے اُن میں سیاسی شعور کی بیداری بھی تھا۔ کانفرنس نے اپنے مقصد اور نصب العین کے مطابق مسلمانوں میں ہر ممکن اور مناسب طریقہ سے صحیح تعلیم کو رائج کیا اور چالیس بیالیس برس کی جہدِ مسلسل سے مسلمانانِ ہند میں تعلیمِ منادی کا فرض بھی سرانجام دیا۔

چنانچہ مسلمانوں میں تعلیمی شعور کی بیداری اور فروغ کے لیے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ہر سال متحدہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر ہوتے رہے۔ جس سے ملک کے طول وعرض میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ دسمبر ۱۹۱۴ء میں اسی سلسلے کی اٹھائیسویں سالانہ کانفرنس راولپنڈی میں منعقد ہوئی۔ جس میں برعظیم کی ممتاز سیاسی وسماجی شخصیات کے علاوہ پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری کو بھی بطور ماہر تعلیم مدعو کیا گیا۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۱۴ء کو سیّد سلیمان اشرف نے کانفرنس کے ساتویں سیشن سے خصوصی خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں کے نظام

تعلیم کے عروج وزوال کا مفصل جائزہ لیا۔ مسلمانانِ ہند کی تعلیمی پستی وزوال کے اسباب وعوامل اور تدارک پر روشنی ڈالی اور مسلمانوں کی تعلیمی زبوں حالی پر نوحہ کناں ہوتے ہوئے کہا:

''جب تک مسلمانوں نے اطاعتِ الٰہی کو اپنا شعار رکھا اور سراً و اعلانیۃً خدا کے بھیجے ہوئے دستور کو اپنا نصب العین بنائے رکھا اور رسولﷺ کی زندگی کا نمونہ اُن کے پیش نظر رہا اُس وقت اُن کی ترقی برق رفتار رہی، آج جس چیز کی بازارِ مسلمین میں کساد بازاری ہے قرون اولیٰ میں اُس کی ایسی فراوانی تھی کہ اپنے تو خیر اپنے ہی تھے بیگانوں تک کے گھروں کی رونق انہی مسلمانوں کے عطیات کا نتیجہ تھا۔دیکھیئے آج یہ رونا ہے کہ مسلمان تمام اقوام سے تعلیم میں پیچھے ہیں اور اِس قدر موخر اور اِس قدر بطی السیر(سست رفتار) ہیں کہ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اُس قوم کے جو اُن کے دوش بدوش آباد ہے کب تک ہم سفر و ہم منزل ہونگے چہ جائے کہ اُن اقوام کے پہلو میں جگہ پانے کے قابل ہوں جو اِس وقت سربفلک ہیں اور ذرا یہ دیکھو کہ مسلمان جب کہ سچ مچ مسلمان تھے تو کیا اسی طرح علوم دنیاوی سے بے نصیب تھے....کیا یہ وہی قوم ہے جو کسی وقت تمام دنیا میں سب کی استاد تھی اور آج شاگردی کے قابل بھی نہ رہی....ہم نے اپنے آپ کو کیا بناڈالا ۔افسوس تباہی خود ہم اپنے اوپر لائیں اور اتہام اسلام پر رکھیں....اب نہ علم ہے نہ تجارت،نہ صنعت ہے نہ زراعت، ہائے ہائے کیا کردیا۔اسلاف کے کارنامہ پڑھ کر فخر ومباہات کرتے رہو اِس سے کیا ہوتا ہے۔''[13]

چنانچہ اُنہوں نے مسلمانوں کی حالتِ زار کو انتہائی دل سوز انداز میں بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''آہ!اے گلشن اسلام کیا ہوئی تیزی بہار جس نے اپنے فیضِ کرم سے خارِ زار جفا کو لالہ زارِ وفا بنادیا تھا،سوکھی کلیاں لبہائے جاناں کی طرح تروتازہ پنکھڑیاں نکال لائی تھیں،ہر شاخ نخل اثمار خوشگوار سے باردار تھی،اور ہر برگ ایک ایک رگ میں لاکھوں چشمے سرسبزی کی امانت رکھتی تھی،تیری باد سموم یورپ کی نسیمِ سحر سے کہیں بڑھ چڑھ کر خدمتِ صبا انجام دیتی تھی،اُس کا ایک جھونکا غنچہائے سر بستہ کو کھلا دیتا تھا۔اب وہی تو ہے وہی تیرے مرغانِ طرب کی صدائیں ولیکن نہ کوئی کان اُن کو سننا گوارا کرتا ہے نہ کوئی دماغ اُن سے راحت پاتا ہے،عقل کو حیرت ہے اور ذہن کو چکر کہ آخر دیکھتے دیکھتے یہ رنگ چمن کیونکر بدلا۔ باغبانی کی خدمت جن کے قبضۂ قدرت میں دی گئی تھی وہ کیوں تبر لیے سڈول و بیڈول کوئی شاخ نہیں دیکھتے چھانٹنے پر تلے بیٹھے ہیں۔''[14]

سیّد سلیمان اشرف نے اپنے خصوصی خطاب میں جدید تعلیم وزبان کی اہمیت وافادیت اور ضرورت کو دین اسلام کی روشنی میں واضح کرتے ہوئے اِسے مومن کی گمشدہ میراث قرار دیا اور مسلمانوں کو اِس کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے فرمایا کہ یہ تمہاری اپنی چیز ہے، تمہیں جہاں سے ملے، حاصل کرلو۔ چنانچہ اِسی شعور کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کوئی وجہ نہیں کہ قرآن ہمیں جن اُمور کی طرف رہنمائی کرے، جن سے بہرہ مند ہونے کی ترغیب دلائے، ہم اُسے مذہب کے خلاف سمجھیں.... رہی یہ بات کہ کون سی زبان میں اِن علوم کو پڑھیں ؟اِس تنگ وقت میں زیادہ بحث کا موقع تو نہیں لیکن اِس قدر سمجھ لیجئے کہ اردو، فارسی، پنجابی، پشتو، بنگلہ وغیرہ تو جائز ہوں، مگر یورپ کی زبان حرام، آخر اس کی وجہ ؟ اگر آج تمام یورپ یا کوئی اُس کا حصہ دائرہ اسلام میں آجائے تو کیا اُسے اپنی مادری زبان کا بولنا یا اُس میں پڑھنا حرام ہو جائے گا۔؟ کیوں خدا کی رحمت کو اِس قدر تنگ کیا جائے ؟ اور ترجیح بلا مرجح دی جاوے۔؟ **الحکمۃ ضالۃ المومن۔** حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے جہاں تمہیں مل جائے اُسے فوراً اُٹھالو۔

سخن کز بہر حق گوئی چہ عبرانی چہ سُریانی

مکان کز بہر او جوئی چہ جابلقا چہ جابلسا''[15]

سیّد سلیمان اشرف کے اِن ارشادات کا پس منظر دراصل کچھ مسلمان رہنماؤں کی جانب سے انگریزی تعلیم کی اِس بناء پر مخالفت تھی کہ غیر ملکی اور غیر قوم کی زبان سیکھنا مذہباً جائز نہیں ہے۔ اُس وقت برعظیم کے جن مسلم اکابرین نے اِس نظریۂ تعلیم کو خصوصیت سے ہدفِ تنقید بنایا، اُن میں مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۸ء) سرفہرست ہیں۔ آزاد کا خیال تھا کہ :

''تاریخ اِس طرزِ تعلیم کے لیے کوئی جواز پیش کرنے سے قاصر ہے۔ جس کی میکالے نے (بنیاد) ڈالی تھی۔ میکالے کی یہ دلیل کہ سنسکرت اور فارسی کو ذریعۂ تعلیم نہیں قرار دیا جاسکتا، غلط نہیں ہے لیکن اِس کے ساتھ ہی یہ حجت لغو ہے کہ ذریعۂ تعلیم صرف انگریزی زبان ہو سکتی ہے۔''[16]

مولانا آزاد کی اِس مخالفت اور عذر گناہی کی توجیہہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری نے لکھا:

''آپ (آزاد) نے اِس بات کی وضاحت تو نہیں کی کہ وہ کون سی زبان ہونی چاہئے جسے برصغیر کی اقوام کے لیے ذریعۂ تعلیم بنایا جائے، تاہم ایک مستند عالم دین اور عبقری شخصیت ہونے کے ناطے ظاہر ہے کہ آپ کی پسندیدہ زبان (Choice) عربی ہی ہو سکتی ہے جو آپ کی مادری زبان بھی تھی۔ ورنہ کم از کم اُردو، جس کے آپ صاحب طرز ادیب تھے۔''[17]

اَمر واقعہ یہ ہے کہ ابوالکلام آزاد کے علاوہ اور بھی بہت سے افراد ایسے تھے جو مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کے حصول کے شدید مخالف تھے۔ جن کی تنگ نظری اور کوتاہ فکری کو نمایاں کرتے ہوئے ممتاز دانشور میاں عبدالرشید نے لکھا:

''موخر الذکر (دیوبند) کا طرز عمل یہ تھا کہ ہر مغربی چیز بری ہے۔ اس کے قریب نہ جاؤ۔ نہ انگریزی پڑھو۔ نہ مغربی معیشت اپناؤ.... اِس روش نے انہیں حقیقت پسندی اور مبنی بر معقولیت سوچ دونوں سے محروم کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُنہوں نے شرعی اور سیاسی دونوں معاملات میں ٹھوکریں کھائیں۔ حضراتِ دیوبند بالعموم مغربی تعلیم سے متنفر رہے اور.... کانگریس کی تحریکِ وطنیت سے وابستہ رہے، جس سے بالآخر ہندو کو فائدہ پہنچا.... وہ (مولانا حسین احمد مدنی) بالکل ہی کانگریس کی گود میں چلے گئے.... اُن کی کانگریس سے وابستگی نے مسلمانوں کو بہت سیاسی نقصان پہنچایا۔ سوائے مولانا شبیر احمد عثمانی اور اُن کے چند رفقاء کے ان میں سے کسی قابل قدر ہستی نے تحریک پاکستان کا ساتھ نہ دیا.... اُنہوں نے اپنے بزرگوں کی وسعتِ نظری

کو بھی ترک کر دیا اور روحِ اسلام کو نظر انداز کر کے چھوٹی باتوں پر زور دینے اور لڑنے جھگڑنے لگے۔ خاص طور پر اُن کے افکارِ مغرب سے بے زاری نے انہیں بہت نقصان پہنچایا۔ اپنے ذہنوں کو مسدود کر لینے کے باعث اُن کے فکر کے سوتے خشک ہو گئے۔''[18]

ایسے وقت میں سیّد سلیمان اشرف جو جدید عصری علوم کی ضرورت و اہمیت سے آگاہ اور اس کے حصول کو قومی و ملی حقوق اور سیاسی بیداری کے لیے لازم و ملزوم سمجھتے تھے، آزاد اور اُن جیسی طرز فکر رکھنے والے رہنماؤں کی فکری کجی کی نفی کرتے ہیں اور علومِ اسلامیہ کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کرتے ہوئے واضح کرتے ہیں کہ آج ظالم و غاصب حکمرانوں کے خلاف حقوق اور آزادی کے لیے سینہ سپر کوئی اور نہیں وہی لوگ ہیں جو جدید درس گاہوں کے تعلیم وسند یافتہ ہیں۔ چنانچہ اِس حوالے سے ''النور'' میں لکھتے ہیں:

''یہ واقعہ ہے، حقیقت ہے اِس سے انکار کرنا سورج کی روشنی سے انکار کرنا ہے کہ ہندوستانیوں کا حکومت کے سامنے آنا، اپنے مطالبات کو موثر پیرائے میں پیش کرنا، ثبات و قرار سے اپنے حقوق کے طلب میں مسلسل سر گرم کار رہنا اور پھر اپنی کامیابی کے لیے ایثار و قربانی سے دریغ نہ کرنا، یہ سب انگریزی تعلیم کا ثمرہ ہے۔ آئینِ سلطنت پر جنھوں نے نکتہ چینی کی ہے، وہ انگریزی خواں ہیں۔ حکومتِ خود اختیاری کا جنھوں نے نعرہ بلند کیا ہے وہ انگریزی خواں ہیں۔ غلامی کی ذلتوں کا جس نے احساس پیدا کیا ہے وہ انگریزی خواں ہیں۔ قید خانوں میں سب سے پہلا قدم جن کا پہنچا ہے وہ انگریزی خواں ہیں۔ دار ورسن سے جن کے گلے پہلے آشنا ہوئے وہ انگریزی خواں ہیں۔ طرفگی یہ کہ سارے انگریزی خواں انہی کالجوں کے تعلیم یافتہ اور سند یاب ہیں جن کا الحاق گورنمنٹ کی یونیورسٹیوں سے ہے، سرکاری کالج یا امدادی کالج میں تعلیم پانے سے اُن کے جذبات قومی نہ فنا ہوئے نہ مٹے۔''[19]

اِس کے باوجود جب جدید عصری علوم کے حامیوں کو اراکین خلافت کمیٹی اور جمعیت علمائے ہند کے قائدین و مفتیان کی جانب سے انگریز نوازی کا طعنہ دیا گیا اور ۱۹۲۰ء میں آزاد قومی یونیورسٹی کے قیام کی آڑ میں مسلمانوں کے تعلیمی ادارے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اسلامیہ کالج لاہور اور پشاور کو نشانہ بنایا گیا تو سیّد سلیمان اشرف نے اُس وقت حقیقت حال سے پردہ اٹھاتے ہوئے جدید تعلیم یافتہ افراد کی نہ صرف وجودی اہمیت سے آگاہ کیا بلکہ جدید تعلیم کے مخالفین کو آئینہ دکھاتے ہوئے اُن کی نقاب کشائی بھی فرمائی اور اُنہیں حقیقت کا آئینہ دکھاتے ہوئے لکھا:

''اِس وقت علمائے سیاسی میں جو جوش و خروش ہے وہ بھی نتیجہ اِن ہی انگریزی خوانوں کا ہے، اِن ہی کے ہاتھوں نے اُنہیں جھنجھوڑا، جب اُن کی آنکھیں کھلیں، اُنہی کے ہاتھوں نے سہارا دیا، جب اُن کے قدم اٹھے اِن ہی کی آوازوں نے اِن کی زبانیں کھولیں، جب یہ بولنے لگے۔ رہا گروہ علمائے ربانیین کا وہ پہلے بھی عُقلائے دنیا سے بے نیاز تھا اور آج بھی مستغنی ہے۔

ملک کا جناح اُن کے زیرِ قدم ہے

عزیزوں کا قد سامنے اُن کے خم ہے

اِس وقت بھی انگریزی خواں جماعت اِن تحریکات سے الگ ہو جائے تو سارے جمعیت العلماء کے فضلائے یگانہ اپنی اپنی درسگاہوں میں ہوں گے یا منبر و محراب میں، کسی یتیم خانہ یا مدرسہ یا انجمن اسلامیہ کا وعظ فرما کر آخر میں تحریک چندہ فرماتے ہوں گے۔ وزرائے انگلستان کے آراء پر تنقید اور سیاست ہند پر مباحثہ کسی کے وہم میں نہ آئے گا۔ع گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش، فرماتے ہوئے سیاست کے سارے ابواب طے فرمادیں گے۔"[20]

جدید تعلیم کے مخالفین کی اِس روش پر چشم کشا تبصرہ کرتے ہوئے ظہورالدین امر تسری سیّد سلیمان اشرف کی کتاب "الخطاب" طبع جدید کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ستم ظریفی دیکھیے کہ:

"بد قسمتی کیسے اِس قوم کی ہمرکاب رہی کہ موہوم و مفروض خدشات کو بنیاد بنا کر علوم عصری پر رقیب اقوام کے برابر لانے بلکہ اُن پر سبقت لے جانے کی سعیٔ جمیل کے خلاف علمائے دین سے ایسے فتاویٰ حاصل کیے گئے جس کے باعث اِس راہ روشن کو تاریکیوں سے ڈھانپ کر ملت کی منزل کھوٹی کی گئی..... بعض ایسے ایمان فروش مفاد پرست بھی ہیں کہ اِن فتاویٰ کے پشتارے اپنی کمر پر اٹھائے سر بازار نفرتوں کی تجارت سے پیٹ کا دوزخ بھر رہے ہیں.... مقام صد اطمینان یہ ہے کہ ہر ہر دور میں صاحبانِ بصیرت نے بنظر غائر حقائق کو دیکھا اور رائے عامہ کی رو میں بہہ نکلنے کے بجائے اپنی بات دوٹوک انداز میں کہی۔ چنانچہ فتاویٰ کی بھیڑ میں علامہ شاہ احمد نورانی صدیقیؒ کے والد گرامی حضرت مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھیؒ کا فتویٰ (جو رسالہ "الدلائل القاہرۃ علی الکفرۃ النیاشرۃ"، مطبع اہل سنت و جماعت بریلی ۱۹۱۷ء ص ۳۵ پر موجود ہے) ایک روشن چراغ کی مانند آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ اُن کی دوررس نگاہ کو خراج تحسین پیش کرتا نظر آتا ہے۔"[21]

اسلام زندگی آمیز اور زندگی آموز تعلیم کا داعی ہے۔اِس کے پیش نظر محض نظریاتی تعلیم ہی نہیں بلکہ ایسی ہمہ گیر تعلیم ہے جو صرف طالب علم کے لیے ہی نہیں بلکہ ملک و ملت کے لیے بھی ہر پہلو سے مفید اور نافع ہو۔اسلام کبھی بھی ترقی و ارتقاء کا مخالف نہیں رہا۔اِس کے برعکس یہ افراد کی ذہنی و تعلیمی سرگرمیوں کو بنظر استحسان دیکھتا ہے۔دنیا کے کسی مذہب نے تعقل و تفکر و تدبر پر اتنا زور نہیں دیا جتنا کہ اسلام نے دیا ہے، چنانچہ یہ خواہش کسی طرح بھی ناجائز نہیں کہ مسلمان بھی مغربی ممالک کی طرح سائنسی علوم و فنون میں ترقی کریں اور معاشی وسائل سے کماحقہ مستفید ہوں لیکن مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ احتیاط لازم ہے کہ اِس راہ میں مغرب کی ملحدانہ سوچ کے بجائے اسلامی فکر و فلسفہ کو رہنما اصول بنایا جائے۔مندرجہ بالا تناظر میں دیکھا جائے تو پروفیسر سیّد سلیمان اشرف جدید عصری علوم کے حصول کے کبھی بھی مخالف نہیں رہے۔آپ وقت اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے ہم آہنگ رہنے کے لیے اِس کی ضرورت و اہمیت سے واقف تھے۔چنانچہ اپنی کتاب "السبیل" میں اِس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اِس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حکومت و سلطنت کے ساتھ صرف درہم و دینار ہی کا خزانہ عطا نہیں ہوتا بلکہ بہت سے کمالات و محاسن اِس کے علاوہ ایسے ہوتے ہیں جن کی پرستش و قدردانی بعد از زوالِ سلطنت بھی باقی رہتی ہے۔اِس وقت کے خطہ یورپ سریر آرائے سلطنت ہے وہاں کی زبانوں کا جاننا خالی از منفعت نہیں۔اِس لیے انگریزی تعلیم سے اعراض و چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔"[22]

سیّد سلیمان اشرف دینی و عصری علوم میں امتزاج کے قائل ہیں اور اِسے دور جدید کی اہم ضرورت خیال کرتے ہیں۔ آپ جدید تعلیم کو اسلامی اقدار وروایات کی روشنی میں دیکھنے کے بھی حامی ہیں اور ایسے نظام تعلیم جس کی بنیادیں مادہ پرستی اور ملحدانہ نظریات پر قائم ہوں جو فکری و نظری بالیدگی پیدا کرنے کے بجائے کج روی اور گمراہی کو فروغ دیتا ہو اور غلامانہ ذہنیت کی آبیاری کرتا ہو، کو مسلمانوں کے لیے زہر قاتل سمجھتے تھے۔ آپ سمجھتے تھے جدید علوم اُس صورت میں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے جب علم وفن کے ذریعے حاصل کردہ قوت و حشمت میں لاالٰہ کا جوہر نمایاں ہو کیونکہ الحادی علم ایمان کی روشنی چھین لیتا ہے۔

جوہر میں ہو لاالٰہ تو کیا خوف

تعلیم ہو گو فرنگیانہ

چنانچہ اُنہوں نے مشرق و مغرب کے فلسفۂ تعلیم اور نظامِ تعلیم دونوں کو سامنے رکھا۔ ایک دوسرے سے تقابل کیا۔ خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیا اور بتایا ہے کہ ہماری درس گاہوں کو کس قسم کی تعلیم اور نظام تعلیم کی ضرورت ہے۔ آپ کے نزدیک مسلمانانِ ہند کے لیے جدید تعلیم کا حصول ایک ضروری اَمر تھا لیکن اِس کے حصول کی تگ ودو میں غیر مسلم اقوام کے رسم ورواج اور تہذیب و تمدن کی نقّالی اور اندھی تقلید دین و مذہب سے دوری اور اپنی جداگانہ قومیت کی تباہی و بربادی تھی۔ چنانچہ اِس تناظر میں آپ نے مسلم معاشرے پر مغربی تہذیب و تمدن اور بود و باش کے منفی اثرات کو بیان کرتے ہوئے لکھا:

''مسلمانوں کی انتہائی بد قسمتی یہی ہے کہ یہ کسی غیر قوم کی طرف اِس غرض سے بڑھتے ہیں کہ اپنی حیاتِ دنیا سنوارنے کا طریقہ اُس سے سیکھیں لیکن اِس سے پیشتر کہ اُن وسائل واسباب پر اُنہیں دسترس ہو دین و مذہب پہلے کھو بیٹھتے ہیں۔''[23]

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ اِس بات کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

سیّد سلیمان اشرف اِس روش کے منفی اثرات و نقصانات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب سے مسلمان یورپی تہذیب و تمدن میں جذب ہوئے:

''مسلمانوں کی شکل و صورت لباس و پوشاک طرز ماند و بود غرض ہر ایک شعبۂ حیات میں یورپ کی ہی تجلّی تھی۔ حتیٰ کہ نام تک یورپین تلفّظ واِملا میں شامل کر لیا گیا۔ ارکان اسلام سے بیگانہ وشی لوازم تہذیب و تعلیم قرار پائے۔''[24]

مسلمانانِ ہند کی بہتر معاشی اور معاشرتی زندگی کے لیے جدید تعلیم کا حصول اگر تقاضہ وقت تھا تو قومی و ملی تشخص اور دینی زندگی کی بقاء کے لیے اسلامی علوم کا حصول ایک لازمی اَمر تھا۔ سیّد سلیمان اشرف نے دونوں کی اہمیت اور افادیت کو مد نظر رکھا اور متوازن راہِ عمل اختیار کرتے ہوئے لکھا:

''مسلمانانِ ہند کو اپنی وجاہت ،اپنی معاشرت اور اپنے خوش منظر تمدن کے لیے انگریزی تعلیم سے مفر نہیں لیکن اپنی قومیت اپنی ملیّ خصوصیت اور اپنی مذہبی زندگی کی بقاء کے لیے علومِ اسلامیہ سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔''[25]

اُن کے نزدیک ملتِ اسلامیہ کا مستقبل اسلام اور صرف اسلام سے وابستہ ہے اور وہ دنیاوی جاہ ومنفعت کے لیے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستے کو ترک کرنا پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ مسلمانوں کو دعوت فکر و عمل دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دوستو! کیا یہ بے انصافی نہ ہوگی کہ ہم اپنے مطیعوں سے توکام لیں کائنات سے بہرہ مند ہوتے رہیں، لیکن جس کی اطاعت کے لیے ہم پیدا کیے گئے ہیں اُس کی طرف بھول کر بھی توجہ نہ کریں بلکہ اُسے ایک لایعنی اَمر سمجھیں، یہ کیسی بے انصافی و صریح ہٹ دھرمی ہے۔ اگر یہ پہلو ہماری زندگی کا تاریک رہا تو ہم کمال انسانی کے عرفان سے قاصر رہے اور سخت باز پرسِ منعمِ حقیقی کی اپنے اوپر عائد کرلی، بغیر اطاعت الٰہی وعبادتِ معبود جو زندگی بسر ہوئی وہ حیوانی حیات سے ایک انچ بھی نہ بڑھ سکی....اِس دور ایام کو کیا کہیے کہ ایک طرف تو جہالت کی گھٹا چھائی ہوئی ہے، دوسری طرف تدیّن (دین داری وپرہیز گاری) سے دامانِ عمل خالی ہے۔ عامۃ المسلمین کی حالت کا اندازہ کر جاؤ تو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ ہم راہِ مستقیم سے کس قدر منحرف ہوگئے ہیں۔''[26]

سیّد سلیمان اشرف ایسے جدید نظام تعلیم کے سخت مخالف تھے جس کی بنیادیں مادہ پرستی اور ملحدانہ نظریات پر قائم ہوں، جو فکری و نظری بالیدگی پیدا کرنے کے بجائے کج روی اور گمراہی کو فروغ دیتا ہو، کفر و الحاد کی پرورش کرتا ہو اور غلامانہ ذہنیت کی آبیاری کرتا ہو۔ وہ ایسے نظامِ تعلیم کو مسلمانوں کے لیے زہرِ قاتل سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک طلباء کی ذہنی تربیت واصلاح، صلاحیتوں کی نشو و نما اور قومی و ملی نصب العین کی بیداری و حصول کے لیے ضروری تھا کہ اُنہیں جدید نظام تعلیم کے اِن مضر اثرات سے بچایا جائے اور اُن میں صداقت، دیانت، عدل وانصاف اور شجاعت جیسے اوصافِ حمیدہ کے ساتھ خوفِ خدا و حبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جوہر پیدا کرنے کے لیے ایک ایسا نظامِ تعلیم و تربیت تشکیل دیا جائے جو ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت سے عبارت ہو۔ چنانچہ اِس تناظر میں لکھتے ہیں:

''جب علم کے پڑھنے سے خوف خدا پیدا نہ ہو، معاصی کی برائیاں معلوم نہ ہوں، جذبات پر قوت حاصل نہ ہو، وہ تعلق جو خدا سے ہونا ضروری ہے پایا نہ جائے تو پھر اُسے علم حقیقی کیونکر کہا جائے گا۔ علم حقیقی تو وہی ہے جس کے پڑھنے سے خشیتِ ایزدی دل میں پیدا ہوتی ہے اور یہی کیفیت دل میں پیدا ہو کر عالم و معاصی کے درمیان بطور پردہ کے حائل ہو جاتی ہے اور یہ اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک دربارِ رسالت ﷺ سے لگاؤ نہ پیدا کر لیا جائے۔ جس قدر دل میں یہ لگن بڑھتی جائے گی اُسی قدر عبادات صحیح اور معاملات درست ہونگے۔''[27]

سیّد سلیمان اشرف پھر اُنہیں زندگی کا صحیح مقصد و محور متعین کرنے کا راستہ دکھاتے ہوئے غور وتدبّر کی دعوت دیتے ہیں اور اپنی کتاب ''الخطاب'' میں لکھتے ہیں:

''یہ بے سروپا زندگی کب تک۔ ہفوات ولایعنی کلمات کا ورد کہاں تک۔ عمر گراں بہا کا صَرف کس حد تک۔ آؤ ہم اپنی زندگی کا کوئی مقصد قرار دیں تاکہ ہمارے اقوال وافعال ایک محور پر گردش کریں۔ جب تک اقوال وافعال کا کوئی محور قرار نہ دیں گے اُس وقت تک ہماری زندگیاں صحیح نتیجے پر نہ پہنچ سکیں گی۔''[28]

دراصل سیّد سلیمان اشرف کے نزدیک اسلامی نظامِ تعلیم کا مقصد ایسے افراد تیار کرنا ہے جو اپنے دین پر کامل یقین رکھتے ہوں، اُسے اچھی طرح سمجھتے ہوں، جن کی زندگیاں اسلامی تہذیب و تمدن کا عملی نمونہ ہوں، جنھیں اسلامی تہذیب و ثقافت پر فخر ہو، جو کردار و اخلاق میں دوسروں کے لیے مثالی نمونہ ہوں، جن میں اتنی قابلیت اور صلاحیت ہو کہ وہ زندگی کے مسائل کو اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں حل کر سکیں اور جو ذاتی منفعت کو دینی و ملی تقاضوں پر قربان کرنے سے دریغ نہ کریں۔

سیّد سلیمان اشرف چاہتے تھے کہ تعلیمی درس گاہیں دماغ کے ساتھ روح کی غذا کا سامان بھی فراہم کریں۔ دنیاداری کے ساتھ ساتھ دین داری بھی سکھائیں۔ علم و فکر کی روشنی کے ساتھ ساتھ قلب و نظر کی تسکین کا سامان بھی فراہم کریں۔ ظاہر کے ساتھ باطن پر بھی نظر رکھیں اور زندگی کے مختلف مرحلوں میں مادی وسائل کے ساتھ ساتھ باطنی شعور اور خود آگہی کی قوتوں سے بھی کام لیں۔

سیّد سلیمان اشرف کے نزدیک یہ اُسی وقت ممکن تھا جبکہ نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم میں دینی تعلیم کو بنیادی اہمیت دی جائے۔ چنانچہ آپ نے مسلمانوں کے نظامِ تعلیم میں علومِ جدیدہ کے حصول کے ساتھ مروجہ نصابِ اسلامک اسٹڈیز کی اصلاح اور تاریخِ اسلامی کی اہمیت وافادیت کو مدنظر رکھا اور ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل کرنے پر بہت زور دیا۔ پروفیسر سیّد سلیمان اشرف نے اِس موضوع پر مفصّل اظہار خیال کرتے ہوئے ایک مجمل یادداشت متعلق اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ''السبیل'' کے نام سے تحریر فرمائی اور شعبۂ علوم دینیہ اور شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے نصابِ تعلیم اور طریقۂ تعلیم پر اپنا اصلاحی نقطۂ نظر بھی پیش کیا۔

''السبیل''، دراصل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نصابِ تعلیماتِ اسلامیہ کیلئے سیّد صاحب کی جانب سے دی گئی جامع اور تاریخی تجاویز پر مبنی وہ رپورٹ ہے جسے آپ نے وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب احمد خان کی دعوت اور قائم مقام وائس چانسلر نواب مزمل اللہ خاں شروانی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تحریک پر تحریر کیا۔ آپ کی یہ رپورٹ اکیڈمک کونسل میں پیش کی گئی جو منظور کرلی گئی۔ اِس رپورٹ کو نواب مزمل اللہ خاں شروانی نے نا صرف پسند کیا بلکہ اِسے ۱۹۲۴ء میں شائع کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ:

> ''مولانا سیّد سلیمان اشرف صاحب پروفیسر دینیات ایک نہایت بیش بہا اور مہتم بالشان تحریر ہے اور ایک معرکۃ الاآرا مسئلہ پر خیالاتِ قدیم وجدید کا پورا لحاظ کر کے روشنی ڈالی گئی۔ لہٰذا میں بحیثیت چانسلر و خادم حقیر مسلم یونیورسٹی کے اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اِس معاملہ کو روشناسی قوم سے اور قوم کو اِس معرکۃ الآرا مسئلہ کے افادہ سے محروم نہ ہونے دوں۔ لہٰذا میں اِس اصل یادداشت کو مع آرائے حضراتِ موصوف مقدم الذکر طبع کرا کے شائع کرتا ہوں[29]

نواب مزمل اللہ خاں شروانی نے نہ صرف آپ کی تجاویز سے کلی اتفاق کیا بلکہ آپ جیسے تجربہ کار ماہر تعلیم پرنسپل کی زیر نگرانی علوم عربیہ کالج کے قیام کی تجویز دیتے ہوئے یہ بھی لکھا:

> ''اِس یونیورسٹی میں ابتدائی مدارج اسکول وانٹر میڈیٹ کالج سے لے کر یونیورسٹی کلاسوں تک با قاعدہ و مسلسل اسلامی تعلیم، علومِ دینی و دنیوی کی عربی زبان میں ہونی چاہیے اور انگریزی زبان بمرتبہ ثانیہ پڑھائی جائے اور جس طرح کہ یونیورسٹی کے شعبوں میں آرٹس کالج، سائنس کالج، ٹیکنکل کالج، ٹریننگ کالج قائم ہوتے ہیں اور ہونگے اُس ہی طرح علوم عربیہ اسلامیہ کالج علیحدہ قائم کیا جائے اور مولانا سیّد سلیمان اشرف کے سے ماہرین علومِ عقلیہ ونقلیہ جو ضروریاتِ موجودہ سے باخبر ہوں،

اِس کالج کے پرنسپل مقرر کیے جائیں۔"[30]

سر ڈاکٹر ضیاالدین احمد پرووائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بھی سیّد سلیمان اشرف کی تجاویز سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا:

"میں نے مولوی سلیمان اشرف صاحب کا نوٹ پڑھا.... مولوی سلیمان اشرف صاحب نے جو نوٹ لکھا ہے اُس میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کے منشا کی توسیع کی ہے اور مجھے اِس سے کلی اتفاق ہے۔اِسی اصول پر اسلامک اسٹڈیز کا کورس بننا چاہیے۔"[31]

اِسی طرح نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، رکن کونسل و کورٹ اور منسٹر ایجوکیشن بہار واڑیسہ جناب فخر الدین نے بھی سیّد سلیمان اشرف کی تجاویز کی تائید و توثیق کی۔ سیّد سلیمان اشرف نے اسلامک اسٹڈیز کے نصابِ تعلیم میں ترمیم واصلاح کی۔ اُنھوں نےاِس بحث میں اپنے جذبہ قومی وملی اور دینی کے تحت حصہ لیا اور مطالعہ اسلامی کے تحت نصاب میں اہم تبدیلیوں کی بابت اپنی صائب رائے پیش کی تاکہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے حقیقی مقاصد کی طرف بڑھا جاسکے۔

سیّد سلیمان اشرف نے اپنی رپورٹ میں سرکاری یونیورسٹیوں اور بالخصوص مسلم یونیورسٹی میں رائج اسلامی نصابِ تعلیم اور طریقہ تدریس میں موجود خامیوں کی نشاندہی کی اور اِسے بہتر بنانے کیلئے اپنی تجاویز وآراء بھی دیں۔اور اسلامی علوم وفنون سے مسلمانوں کی بے رغبتی کی داستان بیان کرتے ہوئے لکھا:

"اِس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ سرکاری یونیورسٹیوں نے جو نصاب عربی ایم،اے کا مقرر کیا ہے اور جیسی تعلیم عربی کی یونیورسٹیوں میں دی جاتی ہے اُس نے بھی مسلمانوں کو بددل بنا رکھا ہے۔ لیکن چونکہ ایم،اے ہو جانے سے بعض ملازمتوں میں سہولت ہو جاتی ہے اِس لیے کچھ اشخاص اِس میں داخل ہو کر سندِ کامیابی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ طلبہ کا مقصد سند حاصل کرنا ہوتا ہے نہ کر عربی زبان سے آشنا ہونا۔ میری یہ عرض داشت محتاج بیان نہیں کہ مسلم یونیورسٹی جس کی تعلیم عربی کا نصاب دیگر یونیورسٹیوں سے زیادہ مفید ہونا چاہیے وہ سب سے زیادہ مضحکہ انگیز اور وحشت افزا ہے۔ایسی صورت میں علومِ اسلامیہ کی طرف مسلمانوں کا میلان صرف اِس شعبہ کے قائم کردینے سے کیوں کر ہو جائے گا۔لہٰذا : محض علوم اسلامیہ کا انگریزی درس گاہوں میں شعبۂ قائم کردینا جذب وقلوب کیلئے ہرگز کافی نہ ہوگا۔[32]

اُن کے خیال میں موجودہ خامیوں کو دور کرنے کے علاوہ طلباء میں علومِ اسلامیہ کے حصول کی تڑپ ولگن پیدا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اُن میں ذوق وشوق کو بیدار کیا جائے، نصابِ تعلیم وطریقۂ تدریس کو دلچسپ و موثر بنایا جائے، طلباء کی مالی مدد ومعاونت کے لیے وظائف مقرر کیے جائیں، اسلامک اسٹڈیز کی سند کو ایم،اے عربی کی سند پر فوقیت دی جائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اِس شعبہ کا احترام اور اثر ورسوخ قائم کیا جائے۔ چنانچہ اِس کے اسباب وعلل کو واضح کرتے ہوئے اُنھوں نے اسلامی علوم وفنون کی بہتری کے لیے بہت سی کارآمد تجاویز پیش کیں۔اور حکام کی توجہ اِس جانب مبذول کرائی کہ علی گڑھ کے مجوزہ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کو علومِ اسلامیہ کے لیے ایسا نصابِ تعلیم اور نظام تعلیم بنانا اور رائج کرنا چاہیے جس میں علومِ معقولات اور علومِ منقولات پر ہی طلبہ کی مکمل دسترس نہ ہو بلکہ انگزیری کے حصول پر بھی پوری توجہ ہو۔ مزید یہ کہ مذکورہ علوم وفنون کے حاملین کو ایسی اسناد پیش کی جائیں جو گورنمنٹ کی نظر میں وقیع ہوں اور دوسرے شعبوں کے گریجویٹ کے مساوی ہوں۔ چنانچہ ان تجاویز کو اربابِ اختیار کے سامنے پیش کرتے ہوئے آپ نے لکھا:

''اِس وقت اِس کی ضرورت ہے کہ اسلامک اسٹڈیز کو دل گیر و دل پزیر بنانے کے لیے متعدد اور بار بار ذی رسوخ وذی وجاہت ہستیاں مسلم یونیورسٹی کی تحریریں لکھیں،اِس کی اہمیت پر مستقل تقریریں کریں، گورنمنٹ سے استدعا کریں کہ جامع افراد کی قیمت کچھ گراں قرار دے اِسی کے ساتھ طلباء کو وقیع وظیفہ دیا جائے، معمولی ایم اے عربی کے لیے جب کہ وظائف کی ایک اچھی رقم دی جاتی ہے جس کی بدولت چند اشخاص عربی کے ایم اے میں دکھائی دیتے ہیں تو اسلامک اسٹڈیز کی بنیاد بغیر وظائف کیوں کر استوار ہو سکے گی، تقریر و تحریر سے دلوں میں تحریک پیدا کیجئے اور اچھی تعلیم اور وقیع وظیفے سے اِس تحریک کو دلوں میں ثبات وقرار کی قوت عطا کیجئے۔ گورنمنٹ سے یہ استدعا کرکے کہ عربی ایم،اے سے اسلامک اسٹڈیز کی سند بالاتر سمجھی جائے اِس شعبہ کا رسوخ واحترام پیدا کیجئے۔''[33]

مذکورہ تجاویز پیش کرتے ہوئے آپ نے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے لیے تین الگ الگ شعبوں کے قیام کو ضروری قرار دیا اور ان کے لیے نصابِ تعلیم بھی متعین کیا۔اِس متعین کردہ نصاب کے پہلے حصے میں سب سے پہلے عربی زبان کو فنِ ادب کی حیثیت سے داخل نصاب کیا گیا۔ دوسرے حصے میں علومِ اسلامیہ کی جو تفصیل درج کی گئی اُس میں ادب، منقول اور معقول کو بحیثیت فن پڑھانے کی وکالت کی گئی اور تیسرے حصے میں اُن ما قبل اسلام علوم کو شامل کیا گیا جنھیں مسلمانوں کی سرپرستی نے بام عروج پر پہنچادیا۔اوراِس میں منطق، عنصریات، فلکیات، الٰہیات اور ریاضی کے جملہ مضامین کو بھی کو شامل کیا گیا ہے، جبکہ علمِ کلام، تصوف، تاریخ، جغرافیہ، طب کو بھی اسی حصے میں رکھا گیا ۔ مگر سیّد سلیمان اشرف کا مرتب کردہ مذکورہ تینوں اسلامک اسٹڈیز کے لیے مجوزہ شعبے اور اُن کے نصاب وائس چانسلر صاحب زادہ آفتاب احمد خان کے نزدیک ناقابل قبول قرار پائے اور یہ ساری اسکیمیں اور تجاویز اپنی نوعیت اور اہمیت کے اعتبار سے یونیورسٹی کے لیے مفید ثابت نہ ہو سکیں۔ بعد میں وائس چانسلر کی جانب سے آپ کو بی اے کلاس کے لیے ایک ایسے نصاب کی تیاری کا حکم دیا گیا جو اسلامی تاریخ اور فلسفے پر مبنی ہو اور جسے بی اے کے طلباء عربی اور فارسی مضامین کے متبادل کے طور پر اختیار کر سکیں۔ چنانچہ اُنہوں نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ایک بار پھر اِس منصوبے پر کام کیا اور تینوں شعبوں کے الگ الگ نصاب ِ تعلیم اور اسمائے کتب تجویز کرتے ہوئے واضح کر دیا کہ :

''اگرچہ اِس ترتیبِ نصاب پر ''دست و پایم بشکستند و کمانم دادند''(یعنی،اُنہوں نے میرے ہاتھ پاؤں توڑ دیے اور مجھے میری کمان دے دی)صادق آئے گا، مگر المامور معذور۔''[34]

الغرض سیّد سلیمان اشرف نے اِس یادداشت میں جدید علوم وفنون اور زبان وبیان کے علاوہ عربی زبان کی ضرورت اور محاسن وفضائل کے ساتھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے نصابِ علومِ اسلامیہ کا مفہوم وتفصیل بشمول علمِ کلام، تصوف، تاریخ وجغرافیہ اور طب وغیرہ کے فروغ واطلاق کا طریقہ کار ہی بیان نہیں کیا بلکہ آپ نے علمِ ریاضی، علمِ ہندسہ ، علم العدد، علم العدد کے دو اہم شعبے اصولِ اعداد وارثماطیقی اور علمِ ہیٔت و علمِ ہیٔت میں مسلمانوں کے میلان وتحقیق اور کارناموں پر بھی سیر حاصل گفتگو کی اور نصابِ تعلیم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، نصابِ تعلیم اسلامک اسٹڈیز شعبۂ معقول فنِ حکمت اور شعبۂ اسلامک ہسٹری کے لیے توجیہ وتعلیل تعینِ نصاب کا عملی خاکہ بھی پیش کیا۔ بلاشبہ آپ کی یہ یادداشت خطے میں مسلمانوں کی تعلیمی زندگی اور خاص طور پر مطالعاتِ اسلامی کے نشیب وفراز، ماضی کی کوششوں وکاوشوں، جدوجہد وعزائم اور مقاصد کو ہی ہمارے سامنے نہیں لاتی بلکہ اسلامی تعلیمات کے فروغ ونفاذ کا جذبہ تحریک بھی دیتی ہے۔

دراصل سیّد سلیمان اشرف ایک ایسا نظامِ تعلیم چاہتے ہیں جس میں مشرق و مغرب کی ساری خوبیاں مجتمع ہوں اور وہ اُن نقائص سے یکسر پاک ہو جو مشرق یا مغرب کے نظامِ تعلیم میں پائے جاتے ہیں۔ سید صاحب چاہتے تھے کہ یہ تعلیم کتاب و سنت کی روشنی میں دی جائے تاکہ ان علوم سے جو فکری و نظری استعداد پیدا ہو وہ کج روی اور گمراہی سے مملونہ ہو اور ان کے ذریعہ جو علمی قوت حاصل ہو وہ دنیا کے اندر فساد کا سبب نہ بنے۔ آپ چاہتے تھے کہ مسلمان طلباء سائنس اور فلسفہ وغیرہ کو مرعوبانہ و مقلدانہ ذہنیت کے ساتھ نہ حاصل کریں بلکہ وہ اِن کو ایمانی بصیرت اور مومنانہ فراست کے ساتھ اپنے اندر جذب کریں۔ پروفیسر دلاور خان (پرنسپل کالج آف ایجوکیشن ملیر کراچی) سیّد سلیمان اشرف کی اِسی فکر کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مسلمانوں کے سائنسی میدان میں پیچھے رہ جانے کا ایک بنیادی سبب قرآن کے تصورِ کائنات کے مطالعہ کا ناپید ہونا ہے۔ اِس مذہبی کوتاہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اپنی کج فہمی کی بنیاد پر سائنسی تعلیم کے حصول کو غیر اسلامی سمجھتا ہے۔ مطالعہ قرآن کے برعکس سائنس سے دور رہنا عین اسلام قرار دیتا ہے۔ اِس فکر نے اُمت مسلمہ کو قرآن کی سیکڑوں تکوینی آیات سے مستفید ہونے سے محروم کر دیا جب کہ مسلمانوں کا ایک قلیل طبقہ معرفت الٰہی سے عاری سائنس کے مطالعہ کا عادی ہے۔ یہ دونوں طبقات قرآن کی سیکڑوں تکوینی آیات سے انحراف کرتے دکھائی دیتے ہیں اور یہ کسی طرح بھی مسلم اُمہ کے لوازماتِ حیات اور بقائے حیات کے تقاضوں کو پورا کرنے میں ناکام دکھائی دیتے ہیں، اِن کی یہ کج فہمی مسلم اُمہ کے زوال کا باعث ہے۔ سیّد سلیمان اشرف سائنسی تعلیم کو شجر ممنوعہ قرار دینے والوں کو مسلم اُمہ کے لیے سم قاتل سمجھتے ہوئے قرآن کی روشنی میں اُن کی ذہنی، فکری اور مذہبی تربیت کرتے ہیں۔''[35]

اِس مقام پر پروفیسر دلاور خان ''الخطاب'' کے مندرجہ ذیل پیراگراف کو بطور حوالہ استعمال کرتے ہیں جس میں سیّد سلیمان اشرف لکھتے ہیں:

> ''کیا سائنس الٰہی اِس اَمر کو منکشف نہیں کرتا کہ کس چیز کو ہم کس طرح کام میں لائیں؟ اگر یہی بات ہے اور ضرور یہی بات ہے تو میں ڈنکے کی چوٹ سے کہتا ہوں کہ تمدن و سائنس کی سنگِ بنیاد قرآن کریم کی یہی تعلیمات ہیں۔ سائنس پڑھنا، اُس میں کمال پیدا کرنا، حقیقت میں مسخرہ مخلوق سے مستفید ہونا ہے اور اُن کے مسخر ہونے کو بامعنی بنانا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ قرآن ہمیں جن اُمور کی طرف رہنمائی کرے، جن سے بہرہ مند ہونے کی ترغیب دلائے ہم اُسے مذہب کے خلاف سمجھیں، تو پھر کھانا پینا، پہننا، رہنا سب دشوار ہو جائے گا۔''[36]

مذکورہ حوالے کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جدید عصری علوم کے سلسلے میں پروفیسر سلیمان اشرف کسی تنگ نظری کے قائل نہ تھے۔ بلکہ آپ سائنس اور معرفتِ الٰہی کو لازم وملزوم قرار دیتے ہیں۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ آپ کی کتاب ''الخطاب'' کا مطالعہ مسلم سائنس دان اور طالب علم کی قابلیت کے کمال کا اسلامی معیار متعین کرتا ہے اور اُنہیں اِس جانب راغب کرتا ہے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کائنات کی تمام جان دار اور بے جان اشیاء کے حقائق کے اسباب وعلل اور فوائد دریافت کرکے مسلم اُمہ کو اِس قابل بنائے کہ وہ ترقی یافتہ اقوام کی سائنسی میدان میں قیادت وسیادت کر سکے۔ بقول پروفیسر دلاور خان:

''علامہ کے سائنسی افکار کا ایک نہایت ہی اہم نکتہ جو سیکولر سائنس سے اسلامی سائنس کو ممیز و ممتاز کرتا ہے، وہ مظاہرِ فطرت شناسی کے ساتھ ساتھ خدا رسی کا تصور ہے۔ سائنسی میدان میں صرف اُس سائنس میں مسلمانوں کے درد کا درماں ہے جو خدا تک رسائی کا زینہ ہو۔ خلق میں محو ہو کر اُس کے خالق کو فراموش کر دینا تمام سائنسی مسائل کی جڑ ہے۔ آپ مطالعہ سائنس میں خلق اور اُس کے خالق کی معرفت کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں۔ یہی فکر اسلامی فلسفہ سائنس کی تشکیل کا نکتہ آغاز ہے۔''[37]

سیّد سلیمان اشرف مغرب کے لادینی کے نظامِ تعلیم کو اِس لیے غیر موثر اور بے روح خیال کرتے ہیں کہ اُس نے علم کے نام پر دین اور تہذیب کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اُن کے نزدیک یہ طرزِ تعلیم مذہب و اخلاقیات کے خلاف ایک منظم سازش ہے۔ جس نے نئی نسل کو غلامانہ ذہنیت اور تنگ نظری کا شکار بنا دیا تھا۔ اِس طریقہ تعلیم میں پڑھانے والوں میں نہ افکار کی ندرت ہے، نہ خیال کی جدّت، نہ علم کی گہرائی، یہی حال پڑھنے والوں کا ہے کہ نہ اُن میں تحصیلِ علم کا شوق ہے اور نہ ہی حقائق سے آشنا ہونے کی جستجو ہے۔

اِس لیے وہ نظامِ تعلیم کے ذمہ داران اور اداروں سے چاہتے تھے کہ وہ اپنے نظامِ تعلیم اور طریقۂ تدریس میں مغرب کی اندھی تقلید و پیروی کے بجائے تجدید و اجتہاد سے کام لیں، خود کو نسلی، لسانی اور علاقائی تعصبات سے باہر نکالیں اور اپنی درس گاہوں کیلئے ملی حریت پسندی کے شایانِ شان ایسا نصابِ تعلیم مرتب کریں جس کے رہنما اصول قرآن و سنت سے ماخوذ ہوں۔

سیّد سلیمان اشرف نصاب و درس کے تعلق سے جدیدیت کے اور طریقۂ تعلیم کے لحاظ سے قدیم طرزِ فکر کے قائل ہیں۔ آپ کے تعلیمی فلسفہ کی بنیاد مشرقی افکار اور مغربی نظریات میں ہم آہنگی و توازن پر مبنی ہے۔ نصاب اور طریقۂ تعلیم کے حوالے سے آپ کی رائے بڑی معتدل اور معقول ہے۔ ایک عالم دین اور مشرقی اقدار کے علمبردار ہونے کے باوجود سیّد سلیمان اشرف جدید علوم و ٹیکنالوجی کے حصول کو مسلمان قوم کی ترقی کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں۔ آپ کے نزدیک جدید عصری علوم سے دوری اور اجتناب کا نظریہ درست نہیں۔ آپ جانتے تھے کہ علومِ جدیدہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کر کے معاشی و معاشرتی استحکام کا ہی سبب نہیں بنیں گے بلکہ اِس کے حصول سے فہم و آگہی کے کھلنے والے دروازے مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور حصولِ آزادی کیلئے بھی معاون و مددگار ثابت ہوں گے۔

چنانچہ وہ برعظیم کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتے ہوئے اُنہیں احساس دلاتے ہیں کہ ہندو قوم اِس لیے ہم سے آگے نکل گئی ہے کہ اُس نے وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو جدید تعلیمی ضرورتوں سے ہم آہنگ کیا۔ جبکہ ہم ابھی تک اِس کی اہمیت وافادیت سے آشنا ہی نہیں ہوئے اور اگر ہوئے بھی تو ہماری حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔ اِس صورتحال کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انگریزی سلطنت جب اپنے ساتھ علوم مغربیہ ہندوستان میں لائی تو ہندوستانیوں نے دیکھا کہ اب بقاء اور نمود کی زندگی بغیر علوم مغربی حاصل کیے ناممکن ہے، تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا اور ہندوؤں نے بڑھ کر تعلیم انگریزی کا استقبال کیا اور خوش آمدید کا نعرہ بلند کیا۔ جب اِس قوم کے ایک خاص حلقہ میں یہ تعلیم پھیل گئی اور انگریزی واقف کار کچھ ہندوؤں میں تیار ہو گئے تو اُن میں احساس پیدا ہوا اور حکومت کے انداز فرماں روائی پر نکتہ چینی شروع کی، اپنے حقوق کے باب میں صدائے احتجاج بلند کی، ہوم رول، سلف گورنمنٹ یا سوراج کا تخیل سب سے پہلے علم مغربی سے آشنا دماغ میں آیا۔ حکومتِ خود مختاری کی صدا بھی

جس نے اپنے منھ سے نکالی اور ہندوستان کے رہنے والوں کو یہ سامعہ نواز نغمہ جس نے سنایا وہ انگریزی دان ہندوستانی تھا۔ کانگریس جو سوراج کا سنگ بنیاد ہے اس کی تاسیس اور پھر اس عمارت کی تعمیر و تکمیل جن ہاتھوں نے کی وہ سب انگریزی خواں اور انگریزی داں ہیں۔ مسلمانوں میں جب علوم مغربیہ کا آغاز ہوا اور پھر ان میں بھی ایک تعداد تعلیم یافتوں کی تیار ہوگئی تو احساس و تاثیر یہاں بھی ظاہر ہونے لگے لیکن افسوس ہم ابھرتے ہوئے جھونکے میں خزاں کے آئے۔"[38]

دراصل سیّد سلیمان اشرف اِس اَمر کو پاچکے تھے کہ صرف مسلمانوں کی ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر قوم کی ترقی واعلیٰ کامیابی کا راز اور دار و مدار صرف اور صرف مسئلہ تعلیم کے عمدہ طریقے سے حل ہونے پر مبنی ہے۔ آپ جانتے تھے کہ دنیا میں وہی قومیں عروج حاصل کرتی ہیں جو زیورِ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہوں۔ آپ نے مسلمانانِ ہند کے خیالات کی اصلاح کی اور پرزُور مضامین و خطبات کے ذریعے ایسے اوہام و خیالاتِ فرسودہ کی نہ صرف تردید کی بلکہ ثابت کیا کہ مذہب علوم جدیدہ کا مخالف نہیں ہے۔

چنانچہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس راولپنڈی کے اٹھائیسواں سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اُنھوں نے مسلم معاشرے میں در آنے والی خرابیوں کا ہی ذکر نہیں کیا بلکہ مسلم اُمہ کی زبوں حالی کا مرض تشخیص کر کے اُس کا تریاق بھی تجویز کیا۔ آپ نے لکھا:

"جب مسلمان اپنے دستور العمل سے جو خدا نے اُن کے صلاح معاش و معاد کیلئے بھیجا تھا ہٹنے لگے تو سب خرابی آہستہ آہستہ اُن میں آنے لگی۔ اب نہ علم ہے نہ تجارت، نہ صنعت ہے نہ زراعت، ہائے ہائے کیا کرو یا اسلاف کے کارنامے پڑھ کر فخر و مباہات کرتے رہو، اِس سے کیا ہوتا ہے۔ عزیزو! جس طرح کل کا کھانا آج کی بھوک کو رفع نہیں کرتا، اُسی طرح گزشتہ اقبال کا تذکرہ آج ہمیں اقبال مند نہیں بنادے گا۔ جس طرح میت پر نوحہ کرنے سے اُس کی مراجعت نہیں ہوئی، اسی طرح ہائے وائے کرنے سے وہ نعمتِ اسلامی واپس نہیں آتی۔

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدی وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

ہاں اسی چیز کو پھر حاصل کرو جس کے طفیل سب کچھ گیا تھا، بغیر اِس کے ترقی محال ہے اور یہ استحالہ کا حکم میں نہیں دے رہا ہوں بلکہ قرآن کریم کا یہ فتویٰ ہے اور یہ وہ فتویٰ ہے جس کا مشاہدہ تم ہر روز ہر شخص میں کیا کرتے ہو۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَومٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِاَنفُسِهِم۔ اِن جذبات کو جو ہمارے نفوس میں ودیعت کیے گئے ہیں جب تک ہم صحیح راہِ اعتدال پر نہ لائیں گے ہرگز ترقی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔"[39]

اِس کیفیت کی عکاسی کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خان کہتے ہیں ؎

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

چنانچہ سیّد سلیمان اشرف دعوتِ غور و فکر دیتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

''اے حضرات! غور کرو، یہ بے سروپا زندگی کب تک۔ ہفوات ولایعنی کلمات کا ورد کہاں تک۔ عمر گراں بہا کا صرف کس حد تک۔ آؤ اپنی زندگی کا کوئی مقصد قرار دیں تاکہ ہمارے اقوال وافعال ایک محور پر گردش کریں۔''[40]

یہ درست ہے کہ کسی معاشرے کی ایک بہتر، مذہب، منصفانہ اور پرامن ترقی کے سفر کی جانب پیش قدمی علماء واہل علم ودانش کے بغیر ممکن نہیں۔ علماء واہلِ علم ہی وہ طبقہ ہے جو لوگوں کو جہالت کے اندھیروں سے علم روشنی کی طرف لے کر جاتا ہے، شعور وفکر کے دریچے وا کرتا ہے اور معاشرتی مسائل والجھنوں کو اپنی فکری صلاحیتوں سے سلجھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے معاشرے جو علم، فکر، دلیل، فلسفہ اور تحقیق کی بنیاد پر آگے بڑھتے ہیں اُن میں علماء اور اہلِ علم ودانش کو بڑی قدر اور پزیرائی حاصل ہوتی ہے۔ سیّد سلیمان اشرف اہلِ علم اور علماء کی معاشرتی ضرورت کو اجاگر کرتے ہیں اور اُنہیں زمانہ حال کے اہلِ علم کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چند ہستیاں ہنوز ایسی موجود ہیں جو صحت واستعداد اور جید مطالعہ کے ساتھ اپنے فیضِ علم کو طالبِ صادق تک متعدی کر سکتی ہیں۔ لیکن اِن حاملانِ علم کی مثال آفتابِ لبِ بام کی ہے اپنی زندگی کا دور پورا کر چکے ہیں اور ہماری بدشوقی وبدنصیبی کا منحوس منظر دیکھتے دیکھتے ایسے تھک گئے ہیں کہ زاویہ عزلت میں بیٹھ کر دنیا ومافیہا سے بے نیاز اور اپنے ربِّ قدیر کی جناب میں مصروفِ دعا گوئی اُمت مرحومہ ہیں کاش اب بھی مسلمان بیدار ومتنبہ ہوں اور اِن متبرک ہستیوں کے سینہ میں جو زر وجواہر کا خزینہ مکنون ہے اور وہ صرف انہی مسلمانوں کی بے بہا میراث ہے اُسے تہ خاک ہونے سے بچالیں تو اُن کی قومیت کچھ دنوں تک اور بھی بقاء کا فیض پاسکے گی۔ ورنہ جب یہ آفتاب غروب ہو جائے گا تو پھر تاریک شب کی سیاہی مسلمانانِ ہند کی قومیت پر ایسی چھا جائے گی کہ چراغ وشمع کا تو کیا ذکر برقی روشنیاں بھی اُن کے خد وخال اور شکل وصورت کو عیاں نہ کر سکیں گے۔''[41]

سیّد سلیمان اشرف اپنے خطاب میں نام نہاد مذہبی وسیاسی لیڈروں کی جانب سے اُمت کی فلاح وبہبود کے لیے اُن کے تجویز کردہ حل کو ''شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا'' کے عنوان کے تحت رد کرتے ہیں اور فلسفہ کامیابی وکامرانی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آج:

''اصلاح قوم کے لیے کوئی تجارت کی رغبت دلاتا ہے۔ کوئی علومِ مغربی کے سحر آفریں فضائل سناتا ہے۔ کوئی علومِ مشرقی کی ہدایت کرتا ہے ۔ کوئی صنعت وحرفت کی طرف مائل کرتا ہے۔ لیکن خدا تو یہ فرماتا ہے کہ تم میرے مطیع ہو جاؤ پھر سب چیزیں تمہاری تابع فرمان ہو جائیں گی۔

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ ''[42]

(یعنی، تم اللہ کے ہو جاؤ تمام چیزیں تمہاری ہو جائیں گی۔ تم اللہ سے پھر جاؤ گے تمام نعمتیں تم سے منہ موڑ لیں گی)

خلاصۂ کلام

اَمر واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ دونوں صدیاں ہندوستانی اقوام کی سیاسی، سماجی، علمی اور اقتصادی ترقی کے ضمن میں انتہائی اہم ہیں۔ انگریزی اقتدار اور اِس کے نتیجے میں درآمدہ استعماریت اور انگریزی تعلیم نے مسلمانان برصغیر کو تاریخ کے دوراہے پر لا کھڑا کیا۔ اِن حالات میں ضروری تھا

کہ "جدیدیت" کی اِس لہر کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اُن کی من حیث المجموع رہنمائی کی جاتی تاہم اِن دونوں صدیوں میں پیدا ہونے والے اور اپنی قوم وملت کی تاریخ اپنے خونِ جگر سے لکھنے والے اصحابِ فکر کی تعدادیوں تو سینکڑوں میں ہے لیکن مسلمانانِ برعظیم کی ترقی وخوشحالی اور سماجی وسیاسی استحکام اور تعلیمی شعور کی بحالی کیلئے انتھک کوششیں کرنے والی شخصیات کی فہرست میں پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری کا نام نمایاں ہے۔

سیّد سلیمان اشرف نے برعظیم کے مسلمانوں کو دینی وعصری تعلیم کی روشنی میں ایک صحیح قومی شاہراہ پر چلنے کی ترغیب دی اور برطانوی حکومت کے ظلم واستبداد سے نجات کا راستہ بتاتے ہوئے من حیث القوم اپنی شناخت بنائے رکھنے کے لیے راہ بھی ہموار کی۔ یہ اُن کی مومنانہ بصیرت وآگہی ہی تھی جس نے براہِ راست طاغوتی طاقتوں سے ٹکراؤ کے بجائے مسلمانوں میں دینی وعصری علوم کے رجحان کے فروغ کو اپنا مطمحِ نظر بنایا۔ جس سے طلباء میں انگریزی تسلط سے آزادی کا فکری شعور پیدا ہوا اور وہ مسلم لیگ کا دست وبازو بن کر قیامِ پاکستان کی تحریک کے ہراول دستے میں شامل ہوئے۔

قائدِاعظم محمد علی جناحؒ نے اِنہی عوامل کی بنیاد پر نوجوانانِ علی گڑھ کی فکری اور عملی تحریک کو خراجِ تحسین پیش کیا اور علی گڑھ کو اپنی تحریک کا مرکز قرار دیا۔ اُن کے بقول یہیں سے نوجوان ملت آزادی کے سفیر بن کر برعظیم ہندوستان کے ہر کونے میں جاکر مسلمان عوام کو مسلم لیگ کا پیغام پہنچاتے تھے۔ اُنہوں نے نوجوانانِ علی گڑھ کے مشنری جذبہ اور تحریک سے بے لوث لگاؤ کو اپنی ساری متاع قرار دیا۔ قائدِاعظمؒ اپنی انتہائی مصروفیت میں بھی نوجوانانِ علی گڑھ کو یاد رکھتے اور کئی کام چھوڑ کر یہاں تشریف لاتے اور اِن نوجوانوں کی صحبت میں بیٹھ کر اور اِن سے باتیں کرکے اپنے عزم اور ارادے میں تقویت حاصل کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۱۱ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک برعظیم کی ملی تاریخ کے ہر پُرخطر اور کٹھن مرحلے میں ہمیں سیّد سلیمان اشرف کا ہی آہنگ سنائی دیتا ہے، جو اُن کی مروجہ نظامِ تعلیم کا گہرا ادراک، پیشہ ورانہ وابستگی، علمی وفنی مہارت، غیر معمولی دینی غیرت وحمیت اور مومنانہ حق گوئی وبے باکی پر شاہد وعادل ہے۔

❁❁❁

حواشی وحوالہ جات

1۔ پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری، **الخطاب**، (لاہور: ادارہ پاکستان شناسی، طبع جدید، اکتوبر ۲۰۱۶ء)، ص ۴۳۔

2۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، **بھولی ہوئی کہانیاں**، (کراچی: گابا ایجوکیشنل بکس، سن ندارد)، ص ۵۱۔

3۔ بہاری، **الخطاب**، ص ۷۵۔ ۷۴۔

4۔ سیّد بدرالدین احمد، **حقیقت بھی کہانی بھی عظیم آباد کی تہذیبی داستان**، (پٹنہ: بہار اُردو اکیڈمی، ۲۰۰۳ء)، ص ۳۳۱۔ ۳۳۰۔

5۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، **بھولی ہوئی کہانیاں**، ص ۷۲۔

6۔ بہاری، **النوّر**، (لاہور: ادارہ پاکستان شناسی، طبع جدید، اگست ۲۰۰۸ء)، ص ۱۸۴۔ ۱۸۵۔

7۔ بہاری، **السبیل**، (لاہور: ادارہ پاکستان شناسی، طبع جدید، ۲۰۱۴ء)، ص ۱۷۔

8۔ خواجہ غلام السیّدین، **علی گڑھ کی تعلیمی تحریک**، (علی گڑھ: مسلم یونی ورسٹی پریس۔ ۱۹۳۱ء)، ص ۷۔ ۶۔

[9]۔ڈاکٹر احسن اقبال، **شیخ الہند مولانا محمود حسن حیات اور علمی کارنامے**، (علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی، ۱۹۷۳ء)، ص ۳۹۔

[10]۔پروفیسر سید محمد سلیم کے بقول لارڈ میکالے کے نظامِ تعلیم کو اگر تعلیم برائے ملازمت کا عنوان دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔(پروفیسر سید محمد سلیم، **مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ**، ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان، ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۹۔

[11]۔ڈاکٹر نجیب جمال یگانہ، **تحقیقی و تنقیدی مطالعہ**، (لاہور: اظہار سنز۔ ۲۰۱۳ء)، ص ۴۷۔

[12]۔ مولوی عبدالحق، **خطبات عبدالحق**، (کراچی: گلڈ، انجن کتاب گھر وکٹوریہ روڈ، ۱۹۶۴ء)، ص ۴۰۴۔

[13]۔ بہاری، **الخطاب**، ص ۱۹۔۱۸۔۱۷۔

[14]۔ایضاً ص ۳۹۔۴۰۔

[15]۔ایضاً ص ۲۲۔۲۳۔

[16]۔ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری، **فیضان ابوالکلام آزاد**، (لاہور: مکی دارالکتب میکلیگن روڈ، ۲۰۰۴ء)، ص ۲۵۲۔

[17]۔ محولہ بالا۔

[18]۔ میاں عبدالرشید، **پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر**، (لاہور: ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۸۲ء)، ص ۱۱۰۔۱۱۴۔

[19]۔ بہاری، **النور**، ص ۱۹۳۔

[20]۔ایضاً ص ۱۹۴۔

[21]۔بہاری، **الخطاب**، ص ۱۸۔(دیکھیے دیباچہ کا حاشیہ)

[22]۔ بہاری، **السبیل**، ص ۳۲۔

[23]۔ بہاری، پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف، **الرّشاد**، (لاہور: دارالاسلام، طبع جدید، ۲۰۱۱ء)، ص ۱۹۔

[24]۔ محولہ بالا۔

[25]۔ بہاری، **السبیل**، ص ۲۴۔

[26]۔ بہاری، **الخطاب**، ص ۲۳۔۲۴۔

[27]۔ایضاً ۲۸۔

[28]۔ایضاً ص ۳۸۔

[29]۔ بہاری، **السبیل**، ص ا۔

[30]۔ایضاً ص ۵۔۴۔

[31]۔ایضاً ص ۷۔۶۔

[32]۔ایضاً ص ۲۵۔

[33]۔ محولہ بالا۔

[34]۔ ایضاً ص ۴۱۔

[35]۔پروفیسر دلاور خان، **اسلامی فلسفہ سائنس کی تشکیل میں پروفیسر سلیمان اشرف کا کردار**، معارف رضا، کراچی، مارچ ۲۰۱۷ء، ج ۱۸، ش ۳، ص ۳۳۔۳۸۔

[36]۔ بہاری، **الخطاب**، ص ۲۲۔

[37]۔پروفیسر دلاور خان، **اسلامی فلسفہ سائنس کی تشکیل میں پروفیسر سلیمان اشرف کا کردار**، ص ۳۸۔۳۳۔

[38]۔ بہاری، **النور**، ص ۱۹۳۔۱۹۲۔

[39]۔ بہاری، **الخطاب**۔ ص ۱۹۔

[40]۔ایضاً ص ۳۸۔

[41]۔ بہاری، **السبیل**، ص ۱۹۔۱۸۔

[42]۔ایضاً ص ۲۴۔

❁❁❁